تتلی

ایم اے راحت

ہوتے ہیں کہ ان کی ہنسی اور رونے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی ہنسی میں آنسو اور آنسوؤں میں ہنسی کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک کرب ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک طنز ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک دکھ ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک سکھ ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک سوال ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک جواب ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک فلسفہ ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک حکمت ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک زندگی ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک موت ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک روشنی ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک اندھیرا ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک امید ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک مایوسی ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک محبت ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک نفرت ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک انسان ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک حیوان ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک خدا ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک شیطان ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک کائنات ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک ذرہ ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک ابد ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک ازل ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک ماضی ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک مستقبل ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک حال ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک ماضی ہوتا ہے۔ ان کی ہنسی میں ایک مستقبل ہوتا ہے اور ان کے رونے میں ایک حال

ہوا کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو۔“ ہنسی کی یہ آواز ایک ایسے بوڑھے کی تھی جو اپنے ہنسنے پر خود ہی ہنس رہا ہو۔ ”ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو۔“ ہنسی کی آواز سن کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں ہوں۔“ ایک بوڑھے کی آواز آئی۔ ”کون؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں ہوں۔“ بوڑھے کی آواز آئی۔ ”میں

ہے۔"

"ہاں۔" ہاں تو اس نے پوچھا تھا۔ "کیا کہا تھا اس نے؟" ہاں تو اس نے کہ

ایک بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال کے ایک طرف ایک بڑا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ اسٹیج پر ایک بڑا سا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال کے ایک کونے میں ایک بڑا سا ٹی وی لگا ہوا تھا۔ ٹی وی پر کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ ٹی وی کے سامنے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی ٹی وی کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ آدمی ٹی وی کے سامنے کھڑا ہوا کچھ بول رہ

(ایک)

ہوا کے تیز جھونکے ہر طرف سے ٹکرا رہے تھے۔ اقصام الدین ایک بلند ٹیلے پر کھڑا اپنے گرد پھیلے ریت کے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک ریت کے بلند ٹیلے ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں کوئی ٹوٹا پھوٹا مکان یا کوئی اجڑا ہوا کھیت نظر آ جاتا تھا۔ یہ علاقہ کبھی آباد تھا۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ پھر ریت نے آہستہ آہستہ سب کچھ نگل لیا۔ گاؤں کے لوگ اپنے مویشی لے کر کہیں اور چلے گئے۔ صرف چند خاندان رہ گئے جو اپنی زمین چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ اقصام الدین ان میں سے ایک تھا۔ اس کا باپ، دادا، پردادا سب یہیں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی زمین کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے کھیت ریت کے نیچے دبے تھے۔ کنویں ریت سے بھر گئے تھے۔ گاؤں کی مسجد کا مینار آدھا ریت میں دبا ہوا تھا۔ اقصام الدین روز اس مینار کو دیکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گھومتا تھا کہ اگر ریت نہ ہوتی تو یہ زمین کیسی ہوتی۔ وہ اپنے کھیت کو پھر سے کیسا دیکھتا۔ وہ ریت کو ہٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ہر روز کوشش کرتا تھا۔ وہ ہر روز ناکام ہو جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو چکے تھے۔ اس کی کمر جھک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں ریت کی چمک سے سرخ ہو چکی تھیں۔ اس کی بیوی زرینہ اکثر کہتی تھی کہ ریت کو ہٹانا ناممکن ہے۔ وہ ہنس دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ایک آدمی نہ کر سکے تو دو کر سکتے ہیں۔ دو نہ کر سکیں تو چار کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اگر سب مل جائیں تو ریت کو ہٹا دیں گے

(باقی ہے)

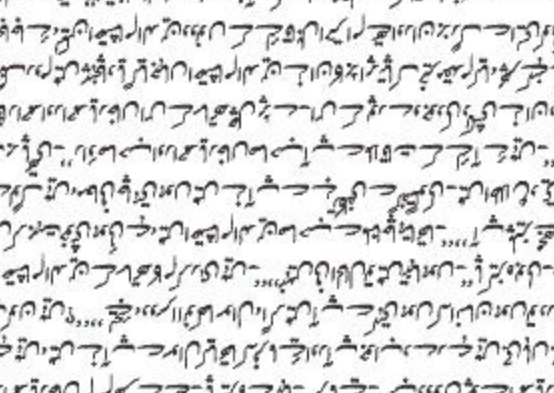

ہمدم دیرینہ، عشاء اللہ خان صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں گفتگو کی تو ڈاکٹر صاحب کے ذکر سے ہمارے ذہن میں ایک ایسے ڈاکٹر کا تصور ابھرا جو ایک ہمدرد، شفیق اور مخلص انسان ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے عشاء اللہ خان صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ وہ ایک ہمدرد انسان

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

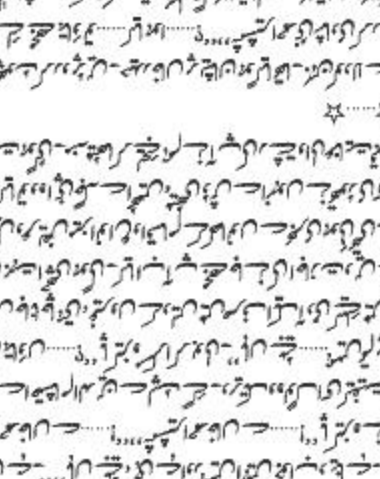

(باقی ہے)

ایک ہفتہ گزرا تھا۔ بیگم صاحبہ پوری طرح صحت یاب ہو کر بیٹھک میں آ چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ ہر صبح وہ کھڑکی کے پردے ہٹا کر باغ کی طرف دیکھتی اور کہتی، “ایک بار پھر زندگی لوٹ آئی ہے۔” گھر میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے طوفان گزر چکا ہو اور ہر چیز اپنی جگہ واپس آ رہی ہو۔

☆……☆……☆

ڈاکٹر نے بیگم صاحبہ کو مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ انہیں کسی قسم کا ذہنی دباؤ یا جذباتی صدمہ برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس لیے گھر میں کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتا تھا جو ان کی طبیعت پر بوجھ ڈالے۔ ڈاکٹر نے واضح کہا تھا کہ دل کا دورہ اکثر ذہنی دباؤ کے بعد ہی پڑتا ہے۔ اس لیے گھر کا ماحول بالکل پرسکون رکھا گیا تھا۔ ملازمین بھی آہستہ بولتے، دروازے دھیرے سے بند کرتے اور ہر کام اس احتیاط سے کرتے جیسے کوئی سوئی ہوئی چیز جاگ نہ جائے۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

☆……☆……☆

بیگم صاحبہ کی طبیعت کچھ دن بعد بحال ہونے لگی تو انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ باغ میں کرسی رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کی طبیعت میں بہتری آئی تو انہوں نے پہلی بار باغ کی طرف دیکھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کے پتے زرد ہو چکے تھے اور ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ کرسی باغ میں رکھی جائے۔ ملازمہ نے فوراً حکم بجا لایا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ملازمہ نے ان کے پاؤں پر کمبل ڈالا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ یہ خاموشی بھی ایک دوا تھی، جو بولے بغیر دی جا رہی تھی۔

ہاں ہے تو ہے ہے ہے

خان صاحب، پاکیزہ کو بھرا ہوا گلاس تھامے کھڑے تھے۔ ایک لمحے ان کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات ابھرے، پاکیزہ نے جلدی سے گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھا۔ خان صاحب کا گھومنا پھرنا ابھی کم ہوا تھا۔ وہ ہر جگہ پاکیزہ کو ساتھ لیے پھرتے تھے۔ پاکیزہ کو ان کے ساتھ ہر جگہ جانا اچھا لگتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی